

وفاقی شرعی عدالت نے بینک انٹرسٹ کو سود اور خرام قرار دیتے ہوئے حکومت کو مہلت دی کہ وہ چھ ماہ کے اندر ملکی معیشت سود سے پاک کر دے۔ اس فیصلے کے بعد حکومت نے تاخیری حربے استعمال کرتے ہوئے سپریم کورٹ میں اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی۔ اس اپیل کی سماعت کا موقع ۲۳ دسمبر ۱۹۹۹ء کو آسکا، عدالت عظمیٰ نے ۱۹۹۱ء کے فیصلے کی نہ صرف توثیق کی بلکہ حکومت کو ۳۰ جون ۲۰۰۱ء تک کی مہلت بھی دی، یہ مدت ختم ہونے کو آئی تو ایک سرکاری بینک یو بی ایل کے ذریعے مزید مہلت طلب کی، یہ مہلت ختم ہونے کے بعد جون ۲۰۰۲ء میں وفاقی شرعی عدالت کے ۱۹۹۱ء کے فیصلے کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ وہ دن اور آج کا دن ہے کہ سود کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکا ہے۔ ملکی معیشت جوں کی توں سودی نظام پر چل رہی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا ایک چکر ہے جو امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بنا رہا ہے۔ عالمی مالیاتی اداروں سے بھاری سودی قرضے لیے جاتے ہیں۔ ان سودی قرضوں کی واپسی کے لیے غریب عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ لاد دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف طاقت ور اشرافیہ بینکوں سے بھاری قرضے لے کر معاف کرا لیتی ہے، اس ”معافی“ کا بوجھ بھی غریب عوام پر ڈالا جاتا ہے۔ کوئی بھی صاحب ایمان شخص سودی کاروبار نہیں کرنا چاہتا، لیکن سرمایہ پرستوں کا ایک چھوٹا سا گروہ اس شیطانی گھن چکر کو چلانے پر بضد ہے۔

وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس صاحب اگر اس پہلو سے ہی غور فرما لیتے تو انہیں بینک انٹرسٹ کے حوالے سے کسی قسم کا اشکال نہ ہوتا۔ یوں بھی اگر جسٹس تنزیل الرحمن مرحوم کا سود کے خلاف دیے گئے فیصلے کا مطالعہ کر لیا جاتا تو ان کی کافی تشفی ہو جاتی۔ بہر حال اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ایک معزز اور باوقار منصب پر بیٹھے شخص کے سود کے بارے میں ذکر کردہ ریمارکس ناقابل توجیہ ہیں۔ ان کے ذاتی خیالات جو بھی ہوں، آئین کی رو سے وہ قرآنی احکام کے مطابق فیصلہ دینے کے پابند ہیں۔ سود کی شاعت و قباح اظہر من الشمس ہے، صرف قرآن و سنت میں نہیں بلکہ دیگر مذاہب میں بھی اس کی ممانعت آئی ہے۔ ہمارے خیال میں کم از کم وفاقی شرعی عدالت کے منصب پر بیٹھے والے شخص کو شرعی علوم کا ماہر ہونا ضروری ہے۔ پارلیمنٹ کو ایسی قانون سازی کرنی چاہیے جو اس سلسلے میں بہتر رہنمائی کرتی ہو۔

مردان یونیورسٹی کا واقعہ... غور طلب پہلو

اپریل ۲۰۱۷ء کو مردان عبدالولی خان یونیورسٹی میں مشعال خان نامی ایک طالب علم کے قتل کا واقعہ پیش آیا جس پر مبینہ طور پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے توہین مذہب اور توہین رسالت کا جرم کیا ہے بلکہ یہ جرم وہ کچھ عرصے سے کر رہا تھا جس کی پاداش کے طور پر اشتعال میں آکر یونیورسٹی کے طلبہ نے اسے مار مار کر قتل کر دیا مرنے سے پہلے اور اس کے بعد اس پر یونیورسٹی کے طلبہ کے تشدد کے مناظر کے ویڈیو سوشل میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا پر ساری دنیا نے دیکھے جس سے پاکستان کے عصری تعلیمی اداروں کی ایک بھیا تک تصویر دنیا کے سامنے گئی۔

اس حقیقت میں دورائے نہیں ہو سکتیں کہ کسی بھی شخص کو محض الزام کی بناء پر سزا اور تشدد کا نشانہ نہیں ٹھہرایا جاسکتا اور اگر الزام ثابت ہو جائے اور ملزم مجرم بن جائے تب بھی اس مجرم کو سزا دینے کا اختیار صرف ریاست اور حکومت کے پاس ہوتا

ہے، کسی بھی عام آدمی کے لیے شریعت اسلام میں اس کی سرے سے گنجائش نہیں کہ وہ قانون اپنے ہاتھ میں لیکر سزا اور جزا کی عقیذہ کرے، اس طرح مُلک و معاشرہ انارکی و رانتشار کی طرف بڑھے گا اور ہر شخص قانون ہاتھ میں لے کر مُلک و ملت کی وحدت اور نظم و نسق کے شیرازہ کو بکھیر کر رکھ دے گا، اس لیے مجرم کی سزا کے نفاذ کا اختیار صرف ریاست اور اس کی عدالت کے ہوتا ہے، یہی شریعت اور فقہائے اسلام کا متفقہ فتویٰ ہے۔ اور اس سلسلے میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں ہے اس لیے یونیورسٹی کے طلبہ کا قانون ہاتھ میں لے کر مشعال خان نامی طالب علم کو قتل کرنا اور اس پر تشدد کرنا قابلِ افسوس بھی ہے اور قابلِ مذمت بھی، ہم لاقانونیت کی راہ اختیار کر کے قتل و تشدد کے اس واقعے کی کھل کر مذمت کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی قابلِ غور ہے اور من حیث القوم ہمیں اس پر تنبیہ کی کے ساتھ غور کرنا ہوگا کہ ایک عام آدمی قانون ہاتھ میں کیوں لیتا ہے، وہ طرم یا مجرم کو خود سزا دینے کی طرف کیوں بڑھتا ہے؟ اس طرح کے حساس مذہبی معاملہ میں وہ ریاست اور عدلیہ کے نظام تنفیذ، سزا و جزا پر اعتماد کیوں نہیں کرتا!... اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ریاستی اور عدالتی نظام، اس سلسلے میں سست بھی ہے اور بیرونی قوتوں کے دباؤ کا شکار بھی... توہین مذہب اور توہین رسالت کے الزام میں جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا، ہماری عدالتی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ جرم ثابت ہونے کے باوجود انہیں سزا نہیں دی گئی، آسیہ مسیح کا کیس سب کے سامنے ہے، اس کے علاوہ گزشتہ دنوں سوشل میڈیا پر اس جرم کا ارتکاب کرنے والے بلاگزربینسا وغیرہ ناموں سے توہین رسالت کرنے والے طرزموں کو ریاستی اداروں نے پکڑا اور چند دن کے بعد انہیں سزا دیئے بغیر چھوڑ دیا، اس سلسلے میں اسلام آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب شوکت عزیز صاحب کے ریمارکس ساری قوم نے پڑھے اور انہوں نے ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنا درد دل قوم کے سامنے رکھا، وزیر داخلہ چوہدری ثار علی خان صاحب نے بھی میڈیا کے سامنے اپنے ایمانی جذبات کا اظہار کیا لیکن مجموعی لحاظ سے قانون پر عمل داری کی صورت حال اطمینان بخش نہیں، اس لیے اس طرح کے حساس اور جذباتی مذہبی معاملہ میں کئی لوگ ریاستی قانونی راستے کو ترک کر کے خود قانون کو ہاتھ میں لیتے ہیں اور لاقانونیت کی راہ پر چل پڑتے ہیں..... ہمیں من حیث القوم اس سلسلہ میں اپنے عدالتی نظام کو آزد، فعال اور قانون پر عمل داری کی صورت حال کو اطمینان بخش بنانا ہوگا، بعض لبرل قسم کے دانش ور اس موقع پر توہین رسالت کی سزا والے قانون کو ختم کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں حالانکہ اس کا حل قانون کو ختم کرنا نہیں، قانون پر عمل داری کو شروع کرنا ہے، اس قانون پر عمل داری کا نظام جس قدر فعال اور مضبوط ہوگا، جس قدر شفاف اور اطمینان بخش ہوگا، اسی قدر اسی طرح کے واقعات کی پیش بندی ہو سکے گی۔

اس حوالہ سے ایک غور طلب پہلو یہ بھی ہے کہ توہین مذہب اور توہین رسالت کا الزام لگا کر قانون ہاتھ میں لینا مجرم ہے اور، لاقانونیت بھی جرم ہے اور توہین مذہب و رسالت بھی جرم ہے، دونوں طرح کے مجرموں کو سزا ہونی چاہیے اور ہمیں پورا پورا عدل و انصاف اور شفافیت ہونی چاہیے (باقی صفحہ نمبر ۴۳)